آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے
غلام محمد قاصر

آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے

غلام محمد قاصر

آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے

غلام محمد قاصر

ناشر: فطرت پبلی کیشنز ۰ لاہور۔

بارِ اول : جنوری ۱۹۸۸ء

خطاطی : نذیر ہاشمی

سرورق : سلیم اختر

ناشر : ڈاکٹر مرتضیٰ عادل
فطرت پبلی کیشنز، لاہور۔

طابع : سید نثار الحسن رضوی

مطبع : انجمن سنز پرنٹرز
۹۔ ریٹی گن روڈ، لاہور

تعداد : ایک ہزار ایک سو

قیمت : ۶۰/۰۰ روپے

سلمیٰ کے نام

فہرست

Scanned by CamScanner

کچھ بے ترتیب ستاروں کو پلکوں نے کیا تسخیر تو کیا
وہ شخص نظر بھر رُک نہ سکا احساس تھا دامن گیر تو کیا

کچھ بنتے مٹتے دائرے سے، اِک شکل ہزاروں تصویریں
سب نقش و نگار عروج پہ تھے آنکھیں تھیں زوال پذیر تو کیا

خوش ہوں کہ کسی کی محفل میں ارزاں تھی متاعِ بیداری
اب آنکھیں ہیں بے خواب تو کیا اب خواب ہیں بے تعبیر تو کیا

خواہش کے مسافر تو اب تک تاریکیِ جاں میں چلتے ہیں
اِک دل کے نہاں خانے میں کہیں جلتی ہے شمعِ ضمیر تو کیا

صحرائے تمنا میں جس کے جینے کا جواز ہی جھونکے ہوں
اس ریت کے ذرّوں نے مل کر اک نام کیا تحریر تو کیا

لکھتا ہوں تو پوروں سے دل تک اک چاندنی سی چھا جاتی ہے
قاصر وہ بلالِ حرف کبھی ہو پائے نہ ماہِ مُنیر تو کیا

بن میں ویراں تھی نظر شہر میں دل روتا ہے
زندگی سے یہ برا دوسرا سمجھوتا ہے

لہلہاتے ہُوئے خوابوں سے مری آنکھوں تک
رت جگے کاشت نہ کر لے تو وہ کب سوتا ہے

جس کو اس فصل میں ہونا ہے برابر کا شریک
میرے احساس میں تنہائیاں کیوں بوتا ہے

نام لکھ لکھ کے ترا ، پھُول بنانے والا
آج پھر شبنمیں آنکھوں سے ورق دھوتا ہے

تیرے بخشے ہوئے اک غم کا کرشمہ ہے کہ اب
جو بھی غم ہو مرے معیار سے کم ہوتا ہے

سو گئے شہرِ محبت کے سبھی داغ و چراغ
ایک سایہ پسِ دیوار ابھی روتا ہے

یہ بھی اِک رنگ ہے شاید مری محرومی کا
کوئی ہنس دے تو محبت کا گماں ہوتا ہے

ندی میں بہتے تھے نیلم زمین دھانی تھی
تمھارے وعدے کی رنگت جو آسمانی تھی

وفا کو دے گئی دھوکا قطار قسموں کی
نئی تھی ڈار مگر کونج تو پُرانی تھی

وہاں تو آج بھی کھلتے ہیں دھڑکنوں کے محاذ
جہاں نگاہ نے پہلی شکست مانی تھی

سروں پہ تیری محبت کا سائباں بھی نہ تھا
جب آفتاب قیامت نے دُھوپ تانی تھی

بدن ملاپ کو بے تاب اور روحوں پر
نہ ملنے والے ستاروں کی حکمرانی تھی

مَیں وہ دیا بھی ہواؤں کی نذر کر بیٹھا
جو میرے پاس تری آخری نشانی تھی

تمام وسعتیں گہرائیوں میں ڈوب گئیں
سمندروں پہ کناروں کی مہربانی تھی

زندگی

دُور تک پھیلی ہُوئی پگڈنڈیوں پر دُھوپ کے پیوند ہیں
سر پہ اِک بھیدوں بھری گٹھڑی اُٹھائے
ایک بُڑھیا، ایک مجبورِ سفر بُڑھیا
جلتے تلووں کے کھجانے کو بھی جُھک سکتی نہیں
چل رہی ہے — چل رہی ہے یوں کہ رُک سکتی نہیں

خواہشوں کی طرح

خواہشوں کی طرح ہر گئے سال کے الوداعی اُجالوں میں دیکھوں اُسے
رُوٹھ کر جانے والوں میں دیکھوں اُسے
اَن کِھلے گلستاں کے روش در روش زعفرانی شگوفے سُلگتے ہُوئے
خشک دریا کی لہروں پہ چلتے ہُوئے
وُہ کہ دھارا بھی روشن ستارہ بھی ہے ٹُوٹتے بجرے کو ساحل کا احساس بھی
اور شکستہ سے ملاح کی آس بھی
نوجوانی سے سرشار خوابوں میں گُم خود سے بھی وہ ملاقات کرتی نہیں
مسکراتی ہے اور بات کرتی نہیں

رات کا ہر اِک منظر رنجشوں سے بوجھل تھا
چاند بھی ادھورا تھا مَیں بھی نامکمل تھا

آنکھ کی منڈیروں پر آرزو نہیں لرزی
اِک چراغ کی لَو سے اِک چراغ اوجھل تھا

جا بلا ترے در کے گم شدہ زمانوں میں
میری عُمر کا حاصل پیار کا جو اِک پَل تھا

کیوں سلگتی آوازیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں
دشتِ نارسائی میں دُھوپ تھی نہ بادل تھا

دُور تو نہ تھا اتنا خیمہ اس کے خوابوں کا
راستے میں اپنی ہی خواہشوں کا جنگل تھا

رات کا ہر اک منظر رنجشوں سے بوجھل تھا
چاند بھی ادھورا تھا میں بھی نامکمل تھا

آنکھ کی منڈیروں پر آرزو نہیں لرزی
اِک چراغ کی لَو سے اِک چراغ اوجھل تھا

جا ملا ترے در کے گم شدہ زمانوں میں
میری عُمر کا حاصل پیار کا جو اِک پَل تھا

کیوں سلگتی آوازیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں
دشتِ نارسائی میں دُھوپ تھی نہ بادل تھا

دُور تو نہ تھا اتنا خیمہ اس کے خوابوں کا
راستے میں اپنی ہی خواہشوں کا جنگل تھا

کل شام بسا

کل شام بسا مرے نینوں میں
کاجل کی جگہ ترا پیار

چاہت کا گلاب چٹک جائے
خوشبو ترے آنگن تک جائے
ترے گھر کی اور دھنک جائے
میں پاؤں رکھوں تو جھنک جائے
پایل کی جگہ ترا پیار

وعدوں کی بھری برسات رہے
یا غم کی سُلگتی رات رہے
تُو آ کے کر دل پر ہاتھ رہے
ہر رنگ میں میرے ساتھ رہے
آنچل کی جگہ ترا پیار

جب یاد کا لمحہ بولے گا
پنچھی کی طرح پَر تولے گا
ساون کے دریچے کھولے گا
پھر پربت پربت ڈولے گا
بادل کی جگہ ترا پیار

چہرہ چہرہ ہر صورت کو اپنی شکل میں ڈھال گیا ہے
شہر کے آئینوں سے باقی سارے عکس نکال گیا ہے

یوں تو عمرِ رواں کا ہر پل اِک الجھن میں ڈال گیا ہے
لیکن دل پر نقش رہے گا ہجر کا یہ جو سال گیا ہے

کون زمانے کے مارے سے اظہارِ ہمدردی کرتا
وہ اپنے ماضی میں گم تھا جس تک میرا حال گیا ہے

اب تو شاید ذکرِ وفا سُن کر بھی میرا دل نہ دھڑکتا
تیری یاد کا جھونکا پھر اس پھول میں خوشبو ڈال گیا ہے

وہی روز و شب

سیاحت کے دوران
نادیدہ و بے کراں ذات کے برِّ اعظم میں جتنی کشش تھی
وہ دامن پسارے ہُوئے دُور کی منتظر کائناتوں میں کب تھی
مگر کل اچانک مجھے
بہت دُور اِک اجنبی
جان پہچان کی آخری حد پہ بیٹھا ہُوا مل گیا
جس کے چہرے کے زخم کُہن پر نئے زخم سایہ فگن تھے
کبھی چاند ہوں گے جہاں اب گہن تھے

جبیں پر کئی جھرّیاں اپنی اپنی دُکانیں سجائے ہُوئی تھیں
اور آنکھوں میں پھر وہ سفینے رواں تھے
کہ جن کو ڈبو کر کئی بار جشنِ مسرت منائے گئے تھے
سبھی رنگ مُجھ کو دِکھائے گئے تھے
نئے سال میں میری خود سے یہ پہلی ملاقات تھی

ذہن میں دائرے سے بناتا رہا دُور ہی دُور سے مسکراتا رہا
مَیں سمندر نہیں چاند کو علم ہے رات بھر پھر بھی مجھ کو بُلاتا رہا

آنکھ میں خیمہ زن نیلگوں وسعتیں اپنا پہلا قدم ہی خلاؤں میں ہے
جو جفا کے جزیرہ نماؤں میں ہے دل کا اس خاکِ خستہ سے ناتا رہا

کج ادائی کی چادر سے مُنہ ڈھانپ کر سونے والا سرِ شام ہی سو گیا
خشک یادوں کے پتّوں بھرے کھیت میں سانپ سا صُبح تک سرسراتا رہا

دیر تک زرد آندھی سی چلتی رہی سانس بُجھتی رہی شمع جلتی رہی
جاں پگھلتی رہی رات ڈھلتی رہی مَیں نہ رُوٹھا مگر وہ مناتا رہا

ان نئی سی صداؤں کے گھیرے میں تھا دیکھتے دیکھتے گھپ اندھیرے میں تھا
وُہ مجھے پا کے دُنیا کے بخشے ہُوئے سب کے سب کھلونے بِکے چلا آ رہا

آزمائش میں ہے وہ گھڑی عید کی چاند نے جس کے آنے کی تائید کی
اِک پھٹے پیرہن پر پسینے کی تہہ ایک گھر خوشبوؤں میں نہاتا رہا

چراغاں کا ہُوا آغاز دِل میں
فروزاں ہے نگاہِ ناز دِل میں

تمنّاؤں کے ہر موسم سے پہلے
اُترتی ہے تری آواز دِل میں

نظر میں مسکراتے عکس تیرے
کیے ہیں اشک لیں انداز دِل میں

کہو تو دھڑکنیں بھی بے خبر ہوں
چُھپا لوں یوں وفا کا راز دل میں

پکارا جا رہا تھا ایک ہی نام
ہُوئے تقسیم جب اعزاز دل میں

زمین و آسماں سے بچ نکلتے
مگر بیٹھا ہے تیر انداز دل میں

کبھی اور اُن کی پہلو بہ پہلو
کئے کا کیا عزیز اعجاز دل میں

مکاں خالی کہاں رہتے ہیں قاصر
کبھی شہلا، کبھی شہناز دل میں

سمیتا پاٹل

دل کے مندر میں خوش بو ہے لوبان کی گھنٹیاں بج اٹھیں دیو داسی تھی وُہ
کتنے سرکش اندھیروں میں جلتی رہی دیکھنے میں تو مشعل ذرا سی تھی وُہ
نُور و نغمہ کی رِم جھم پھواروں تلے مُسکراتی ہُوئی اِک اُداسی تھی وُہ
پانیوں کی فراوانیوں میں رواں اس کی حیرانیاں کتنی پیاسی تھی وُہ

حُسنِ انساں سے فطرت کی سرگوشیاں گھُل گئیں تیرے لہجے کی جھنکار میں
فن کی تکمیل سچّا سراپا ترا ، بے زبانی کو لایا جو اظہار میں
مدّتوں تک نمائش کی خواہش رہی زندگی تب ڈھلی تیرے کردار میں
جو تھی زندہ محبت کی بنیاد پر وقت نے چُن دیا اس کو دیوار میں

دُھوپ ہر رُوپ میں، ریت ہر کھیت میں، فصلِ جذبات پر خشک سالی رہے

دو گھڑی دل کسی کے خیالوں میں گُم اور پھر عمر بھر بے خیالی رہے

آئینہ اب ترستا رہے عکس کو اور نظر روشنی کی سوالی رہے

میرے جیتے کا یہ آنکھ بھر آسماں جگمگاتے ستاروں سے خالی رہے

انہی دُوریوں نے بُجھا دیے وہ دل و نظر کے الاؤ سے
میں نے خود کو کتنی صدائیں دیں تری بے رُخی کے پڑاؤ سے

تری ظلمتوں کے جہان میں مرا دِل جزیرۂ روشنی
مگر اب کے سیلِ سیاہ میں وہ بھی بچ سکا نہ کٹاؤ سے

جہاں زیرِ آب ہے آج تک مری گھر بنانے کی آرزو
وہیں ایک شہر تھا بچ گیا جو ندی کے تیز بہاؤ سے

نہ تو موج موج حباب تھے نہ ہی ساحلوں کے سراب تھے
مرے پار اُترنے کے خواب تھے جو کنارہ کش رہے ناؤ سے

یہاں جتنے تیر بھی آئے ہیں سبھی زہر میں ہیں بجھے ہوئے
کبھی اجنبی کی طرح ملو کبھی دیکھتے ہو لگاؤ سے

جنھیں تختِ دل پہ بٹھائے گا انھیں خاک میں بھی ملائے گا
وُہی فیصلوں کا مجاز ہے جسے ضد ہے اپنے چناؤ سے

محبّت کی گواہی اپنے ہونے کی خبر لے جا
جدھر وہ شخص رہتا ہے مجھے اے دل! ادھر لے جا

سجی ہے بزمِ شبنم تو تبسّم کام آئے گا
تعارف پھول کا درپیش ہے تو چشمِ تر لے جا

اندھیرے میں گیا وہ ، روشنی میں لوٹ آئے گا
دیا جو دل میں جلتا ہے اُسی کو بام پر لے جا

اُڑانوں ، آسمانوں ، آشیانوں کے لیے طائر!
یہ پَر ٹوٹے ہوئے میرے ، یہ معیارِ نظر لے جا

کوئی مُنہ پھیر لیتا ہے تو قاصر اب شکایت کیا
تجھے کس نے کہا تھا آئنے کو توڑ کر لے جا

وصل اور ہجر کی کہانی ہے
زندگی آگ ہے نہ پانی ہے

چاند ہے اور بدگمانی ہے
یہ ستاروں کی مہربانی ہے

مَیں نئے زاویے سے دیکھتا ہُوں
ورنہ تصویر تو پُرانی ہے

ایک آنچل ہے آسماں تو نہیں
کیوں ہر اک رنگ آسمانی ہے

ہونٹ بھی کہہ رہے تھے سچ لیکن
دل نے آنکھوں کی بات مانی ہے

پیار کے عکس لازوال ہوئے
ورنہ جو آئینہ ہے فانی ہے

جس کو دل سے بھلا دیا تُو نے
یہ اُسی شخص کی کہانی ہے

اے شامِ بے قراری!

اے شامِ بے قراری!

اُٹھتے ہیں دِل سے شعلے، باہر ہے برف باری

اُتری جو دھوپ غم کی خوشیوں کے سائے سائے

اس خوف سے کہ ایسے وہ بھی بدل نہ جائے

تصویر اُس کی دِل نے ہر پھول پر اُتاری

خواہش کے رنگ دیکھوں بیجے کے پھول چُن لوں
وہ گنگنا نہ پائے اور میں وہ گیت سُن لوں
چُپ چاپ دل میں آئیں سب درد باری باری

چاہت میں پانے والو! کھونا تو لازمی ہے
اس پیار میں پشیماں ہونا تو لازمی ہے
رونا تو لازمی ہے ہنسنا ہے اختیاری

✺

ہُوئی ہیں بند آنکھیں خواب جاگے
سمندر سو گئے گرداب جاگے

ترے چہرے کو اِک دن چُھو گئی تھی
نظر میں آج تک مہتاب جاگے

دیا دل کو رُت جگوں تک ساتھ اُس نے
کہاں تک دیدۂ بے خواب جاگے

اُجالے چَین سے سوئے ہوئے ہیں
چراغوں میں دلِ بے تاب جاگے

مرے کچّے گھروندے کی صدا پر
کبھی بارش کبھی سیلاب جاگے

خواب سے بیداری تک

خواب میں ایک بے مہر نے میری مشکیں کسیں

ہاتھ اُلجھے تو راہیں نگاہوں سے دامن چھڑانے لگیں

خواب ہی خواب میں پھر غلامی کی سانسوں کو گننا مرا مشغلہ بن گیا

گو مرے علم میں تھا کہ یہ مشغلہ اتنا مہنگا ہے

جس میں

شعور اور احساس کی ساری پونجی لٹا کر

ضمیر و حمیت کے سکے گنوا کر

تہی دامنی کے سوا کچھ نہ پایا کسی نے

تہی دامنی کا اثاثہ لیے میں تو خوش تھا اِدھر

اور اُدھر.....

جنتری کے ورق وقت کے پیڑ سے خشک پتوں کی مانند جھڑتے رہے
(مَیں اسی حال میں سو برس تک فضا میں معلق رہا)
جسم تقویم غم، ذہن تجسیمِ غم آنکھ میں کوئی موسم ٹھہرتا نہ تھا
مر گیا مَیں مگر خواب مرتا نہ تھا
مَیں اسے خواب کا جزو سمجھوں کہ تعبیر کا نام دُوں
جب کسی نے مرے دونوں ہاتھوں سے سب رسّیاں کاٹ دیں
اور مرے پاؤں نے اپنی دھرتی سے رسمِ تعارف ادا کی

آنکھ کھولی تو سب سلسلہ اور تھا
اب غلامی کی سانسیں تھیں اکھڑی ہوئی
جاگتے ہی مرا مشغلہ اور تھا
منزلیں میرے قدموں کو چھونے لگیں
مَیں وہی تھا مگر دوسرا اور تھا

دیکھنے سے مُرجھائے تو وہ لاج وَنتی ہے
ایک بار رُوٹھے تو شکلوں سے مَنتی ہے

چاند ہے کہ سُورج ہے فیصلہ نہیں ہوتا
نیل گُوں دوپٹے سے روشنی سی چھنتی ہے

یوں مصوّری میں گُم ہو رہی ہے خطّاطی
نام جب لکھوں اپنا تیری شکل بنتی ہے

تیری یاد کا پرتو، چاندنی چراغ اور دل
کس قدر اُجالوں سے ایک رات بنتی ہے

اُن کے زرد چہروں سے سوگئی ہے سرسوں تک

زندگی! ترا آنچل آج بھی بسنتی ہے

جب بھی کوئی مشکیزہ آئے میرے خیمے کو

اِک قنات نیزوں کی راستے میں تنتی ہے

زندگی نے پکارا مجھے

زندگی نے پکارا مجھے

کس نے بڑھ کر دیا ہے سہارا مجھے ـــــ زندگی نے پکارا مجھے

زندگی نے پکارا مجھے

آسماں لگ رہا ہے ستارا مجھے ـــــ زندگی نے پکارا مجھے

درد و غم کی کہانی پرانی ہوئی

آج ساری زمیں آسمانی ہوئی

کس بلندی سے دل نے اتارا مجھے ـــــ زندگی نے پکارا مجھے

رنگ ساون کے ہیں باس برسات کی
دل میں چٹکی کلی چاندنی رات کی
فصلِ گُل نے کیا ہے اشارہ مجھے ـــ زندگی نے پکارا مجھے

ہر کوئی اپنے غم کی روانی میں تھا
مَیں بھی پانی میں تھا دل بھی پانی میں تھا
تم ملے تو ملا ہے کنارہ مجھے ـــ زندگی نے پکارا مجھے

آٹھواں آسماں

چشمِ نرگس کے نام آج کا دِن

ہاں مگر اتنا سوچ لو پہلے
یہ زمیں یہ کُرہ ہمارا نہیں

زندگی اِک تناسبِ معکوس
جو گرانی میں اور گُناہ میں ہے
بس دھنک بھر معاوضے کے لیے
کتنے رنگوں نے خودکشی کر لی
زرد زرخیز منظروں کے لیے
آگ نیلی دھواں بھی نیلا ہے

حسرتیں حسرتوں کی قید میں ہیں
ایک نوٹوں بھری تجوری سے
سایہ نکلا ہے ان فرشتوں کا
جن کے اِک لمس کے بغیر یہاں
تن کی بیماریاں نہیں جاتیں
مَن کی ناداریاں نہیں جاتیں
اور خوابوں میں بھوت آتے ہیں

آرزو کی تمام جل پریاں
آتشیں دیو کی پناہ میں ہیں
کون رہتا ہے آسمانوں میں؟
سب ستارے دلِ تباہ میں ہیں

لاش آتی ہے جس محاذ سے بھی
اس کو دفناتے ہیں بصد اعزاز
توپ کے گولے بینڈ کی آواز
رابطے گھر سے لانے پڑتے ہیں
خود ہی آنسو بہانے پڑتے ہیں

چاند کے پار تو اندھیرا ہے
اور جس روشنی میں ہم ہیں یہاں
زندگی ، زندگی کی دشمن ہے

بُعدِ قُطبین کا ہے جسموں میں
لوگ رُوپوش اپنے اِسموں میں
جذبِ دِل گھر گیا طلسموں میں
پس رہے ہیں وصال کے لمحے
یہ زمیں یہ کُرہ ہمارا نہیں

پھر کھلے ہیں مسافرت کے گلاب
نظر آئیں گے جو اُڑان کے بعد
اِک جہان اور اس جہان کے بعد
امتحاں ہی ہے امتحان کے بعد
کتنے جذبوں کے پاؤں دھنسنے لگے
نرم تودے ملے چٹان کے بعد

برف آتش فشاں پہ رکھی ہے
ایک موہوم روشنی کی لکیر
جو سکونت کا استعارہ ہے
درد کا دوسرا کنارا ہے
نسلِ آشندہ کا ستارہ ہے
جس کو ہم چھوڑ بھی نہیں سکتے
اپنا رُخ موڑ بھی نہیں سکتے

شاید اپنا سُراغ مل جائے
اک قیامت زدہ سی غار کے بیچ
اپنا ہی گمشدہ قبیلہ ہے
آٹھواں آسماں بھی نیلا ہے

پھر وہ دریا ہے کناروں سے چھلکنے والا
شہر میں کوئی نہیں آنکھ جھپکنے والا

جس سے ہر شاخ پہ پھُوٹی ترے آنے کی مہک
آم کے پیڑ پہ وہ بُور ہے پکنے والا

یوں تو آنگن میں چراغوں کی فراوانی ہے
بُجھتا جاتا ہے وہ اِک نام چمکنے والا

پھر کہانی میں نشانی کی طرح چھوڑ گیا
دل کی دہلیز پہ اِک درد دھڑکنے والا

ہجر ٹکسال میں ڈھالے گا غزل کے سکّے
تیری محفل میں کبھی بول نہ سکنے والا

غیر سے یوں تیری آنکھوں نے وفا مانگی ہے
آج تو مَیں نے بھی جینے کی دُعا مانگی ہے

گھر میں تُو، صحن میں بیلے ہوں چھتوں پر بیلیں
شہرِ افسوس نے کیا آب و ہوا مانگی ہے

یوں تو اِک یاد کی برسات مرے ساتھ رہی
دل نے ساون کے لیے اور گھٹا مانگی ہے

وہ اندھیرے میں سرِ شام لبِ بام آیا
ایک بیمار ستارے نے دوا مانگی ہے

دل میں آلام کی بڑھتی ہوئی آبادی نے
تیری گلیوں سے بھی تھوڑی سی فضا مانگی ہے

ڈرانے والی بشارت

تم اُس کو بھول بیٹھے ہو
جو ناآسودگی کا بوجھ اُٹھائے

پانیوں سے منحرف تھا
اور گیا واپس نہ آنے کو
اگر وہ چاہتا تو اپنی کشتی کے دریدہ بادباں کو
دامنِ الیاس تک کچھ ایسے پھیلاتا
کہ موجیں اس کی خدمت میں سلامی
اور طوفانِ بلا اس کی طرف سوغاتِ ساحل پیش کرنے کے لیے آتے
تم اُس کو بھول بیٹھے ہو

تمھیں تو وہ سفینہ یاد آتا ہے
جو غرقابی کے منظر پہ
اُبھرتے ڈوبتے لمحے معلق چھوڑ کر گرداب میں اُترا
اور اِک بہتے ہُوئے تختے پہ چھوٹی سی نشانی رکھ گیا
جس پر فرشتہ موت کا بھی رحم کھاتا ہے
تمھیں بھی رحم آتا ہے

تمھیں اب رحم آتا ہے
مگر کل دیکھ لینا
تم جہنم میں جلو گے اور یہ اپنے لیے جنت بنائے گا
یہی سارے سفینوں کے لیے طوفان لکھتے گا
تمھارے ساحلوں پر ریت کے فرمان لکھتے گا
خُدا اس کو کہو گے تب تمھیں انسان لکھتے گا

چنبیلی کھلے

چنبیلی کھلے موتیے مُسکرائیں
چمن کے لیے میری ساری دُعائیں

چٹک کر پکارا جہاں اک کلی نے
سبھی رنگ بکھرا دیے زندگی نے
یہ پتوں کے گوہر گلوں کے نگینے
بس اک سبز موسم کے قصّے سُنائیں

ہر اک گام پر مسکراتے اُجالے
در و بام پر زندگی کے حوالے
ستاروں کو دِل اپنی منزل بنالے
نگاہوں میں یوں راستے جگمگائیں

زمانے کو آبِ رواں کہہ رہے ہیں

تری یاد کو آسماں کہہ رہے ہیں

مرے پیار کی داستاں کہہ رہے ہیں

کہیں شاخِ زیتوں کہیں فاختائیں

صُبح چمکے کبھی شام چمکے

صُبح چمکے کبھی شام چمکے
ہر طرف بس ترا نام چمکے

تُو بلا اور تقدیر جاگی
خواب سوئے تھے تعبیر جاگی
کل جو اُمید تعمیر جاگی

آج تیرے در و بام چمکے

سبزہ و گُل کی آئندہ نسلیں
تیرے پل پل سے سو سو برس لیں
بوئے خوابوں، گلابوں کی فصلیں

جو ستارہ سرِ شام چمکے

خاک پر روشنی کی پھواریں
آسماں پر پرندوں کی ڈاریں
باغ، سرو سمن کی قطاریں
ایک پرچم سرِ بام چمکے

سینہ مدفن بن جاتا ہے جیتے جاگتے رازوں کا
جانچنا زخموں کی گہرائی کام نہیں اندازوں کا

ساری چابیاں میرے حوالے کیں اور اس نے اتنا کہا
آٹھوں پہر حفاظت کرنا شہر کے نو دروازوں کا

سامنے کی آواز سے میرے ہر اک رابطے میں حائل
دائیں بائیں پھیلا لشکر انجانی آوازوں کا

آنکھیں آگے بڑھنا چاہیں پیچھے رہ جاتی ہے نظر
پلکوں کی جھالر پہ نمایاں، کام ستارہ سازوں کا

یوں تو ایک زمانہ گزرا دل دریا کو خشک ہوئے
پھر بھی کسی نے سراغ نہ پایا ڈوبے ہوئے جہازوں کا

کہیں لوگ تنہا، کہیں گھر اکیلے
کہاں تک میں دیکھوں یہ منظر، اکیلے

گلی میں ہواؤں کی سرگوشیاں ہیں
گھروں میں مگر سب صنوبر اکیلے

نمائش ہزاروں نگاہوں نے دیکھی
مگر پھول پہلے سے بڑھ کر اکیلے

اب اِک تیر بھی ہو لیا ساتھ ورنہ
پرندہ چلا تھا سفر پر اکیلے

جو دیکھو تو اک لہریں جا رہے ہیں
جو سوچو تو سارے شناور اکیلے

تری یاد کی برف باری کا موسم
سلگتا رہا دل کے اندر، اکیلے

ارادہ تھا جی لوں گا تجھ سے بچھڑ کر
گزرتا نہیں اِک دسمبر اکیلے

زمانے سے قابرؔ خفا تو نہیں ہیں
کہ دیکھے گئے ہیں وہ اکثر اکیلے

انگ انگ میں

انگ انگ میں پھیلے رنگ جُدائی کے — دیپ جلے تنہائی کے

درشن کے بند جھروکے
کب کھلتے ہیں رو رو کے
کیا پایا ہے سب کچھ کھو کے
آہوں پہ جھونکے ہیں دکھ کے — اب پروائی کے — دیپ جلے تنہائی کے

رم جھم سا وُہ دِل کا عالم
کبھی پھول بنا، کبھی شبنم
اب آس ہے اس کی کم کم
آنکھوں میں ٹھہرے ہیں موسم — اب رسوائی کے — دیپ جلے تنہائی کے

تسکین کہاں اشکوں سے

اُٹھتا ہے دُھواں اشکوں سے

ہر درد عیاں اشکوں سے

ملتے ہیں نشاں اشکوں سے ۔ اِک ہرجائی کے دیپ جلے تنہائی کے

میڈا ماہی وسدے پار

(سرائیکی گیت)

میڈا ماہی وسدے پار
میں رووال اُروار
تے بیڑی ٹھل گئی ہے

وقت پیاں کوں کون سیانڑے
بانہہ موہانڑے کُل انجانڑے
پچھیم وار دوار
تے بیڑی ٹھل گئی ہے

ہو ہم چنتے جنتے ویساں

رب جا نڑے ہُن کنتے ویساں

چھوڑ آئی ہاں گھر بار

تے بیڑی ٹھل گئی ہے

دِل دا درد نصیب ہے جیندا

دریا پار طبیب ہے جیندا

رہ گئی او بیمار

تے بیڑی ٹھل گئی ہے

تُجھ سے نینن لاگے

تُجھ سے نینن لاگے
اب کوئی بھی موسم ہو
مجھ کو ساون لاگے

تجھ سے نینن لاگے
جھونکا تری آہٹ کا
برکھا کی پَوَن لاگے

تُجھ سے نینن لاگے
باہر بھی نراس پھروں
گھر میں بھی نہ مَن لاگے

تجھ سے نینن لاگے
جینے کا جتن کوئی
سینے میں اگن لاگے

تُجھ سے نینن لاگے
ہر دیپ کی باتی میں
تیری ہی لگن لاگے

تُجھ سے نینن لاگے
چاہت میں پُجنریا کیا
تن مَن بھی اُڑن لاگے

تجھ سے نینن لاگے
جینے کا جتن کوئی
سینے میں اگن لاگے

تُجھ سے نینن لاگے
ہر دیپ کی باتی میں
تیری ہی لگن لاگے

تُجھ سے نینن لاگے
چاہت میں پَنچھیا کیا
تن مَن بھی اُڑن لاگے

نیلم نَین سویر!
(کافی)

نیلم نین سویر !
اب کا ہے کی دیر
بیلے مہکے، پنچھی چہکے، اب کا ہے کی دیر

تیری راہ میں پَوَن بچھائے پنکھڑیوں کے ڈھیر
نیلم نین سویر !

تیری آس کی جوت نہ ہو تو چاروں اور اندھیر
نیلم نین سویر !

کچھ تو نسکھوں کا دُور ٹھکانا کچھ راہوں کا پھیر
نیلم نین سویر !

بجھ گئے من آنگن کے دیپک سُونی ہُوئی منڈیر
نیلم نین سویر !

اب کون مہرباں ہو شبِ غم کے حال پر
سُورج خفا ہے ایک سحر کے سوال پر

جُھٹلا سکی نہ آبِ رواں کی گواہیاں
مچھلی جو محوِ رقص تھی لہروں کی تال پر

یہ کوئی تخت و تاج نہیں ہے کہ چھوڑ دوں
سانسوں کا انحصار ہے تیرے خیال پر

دو آشیاں بدوش پرندے تو اُڑ گئے
پتّے مگر بکھر گئے ویران ڈال پر

بے چہرگی کے خوف سے ٹوٹا ہے آئنہ
چھایا تھا ایک عکس مرے خدوخال پر

محفوظ ہیں جو زرد زمانوں کے ظلم سے
وہ پھول مَیں نے دیکھے ہیں اک سبز شال پر

آنکھ سے بچھڑے کاجل کو تحریر بنانے والے
مشکل میں پڑ جائیں گے تصویر بنانے والے

یہ دیوانہ پن تو رہے گا دشت کے سناٹوں میں
سائے میں سو جائیں گے زنجیر بنانے والے

اُس نے تو دیکھے اَن دیکھے خواب سبھی لُٹائے
اور تھے شاید ٹوٹی ہُوئی تعبیر بنانے والے

سونے کی دیوار سے آگے میرے کام نہ آئے
سچے جذبے مٹی کو اکسیر بنانے والے

جزوِ شعر نہیں ہیں قامت جزوِ جاں کر ڈالے
ہم کو جتنے درد ملے تھے میرؔ بنانے والے

دِل کو روؤں

(نذرِ فیض)

بیدار رہیں اس کی آنکھیں ہر دیدۂ بینا سوتا رہا
اِک عمر مصوّر روتا رہا تصویر شریکِ غم نہ ہوئی
کتنے ہی چراغ جلائے گئے ماحول کی ظلمت کم نہ ہوئی
ہر سیلِ اشکِ رواں کی قسم فریاد کی لَے مدھم نہ ہوئی
اس کی مجروح تسلّی جہاں زخموں کے لیے مرہم نہ ہوئی

مظلوم کو زیست سکھا کر وہ ظالم کی انا کو مار گیا
صدیوں سے قلم کے جو ذمّے تھے وہ سارے قرض اُتار گیا
اس پار ہزاروں گریہ کناں وہ چپکے سے اُس پار گیا
اِک شخص کے رخصت ہونے سے ہر عاشق کا پندار گیا
مُجھتی ہے وہ آواز کہ جو مرعوبِ جاہ و حشم نہ ہوئی

رہتے تھے جو وہم کے سائے میں انھیں بجھنے کی آگاہی دی
ہر مجرم صبح کے چہرے کو راتوں سے بڑھ کے سیاہی دی
دُنیا کی عدالت میں اس نے انسان کے حق میں گواہی دی

ہر محفلِ زیست ہوئی برہم اِک زلفِ خرد برہم نہ ہوئی
اِس ہنستے پھُول کے زخموں سے آگاہ ابھی شبنم نہ ہُوئی
کیا دل ہے کہ بہرِ نذرِ وفا اِک بوند لہو کی بہم نہ ہُوئی
اس آنکھ کا ماتم کون کرے جو مرگِ فیضؔ پہ نم نہ ہُوئی

سوزِ ہجراں سے خشک پات جلے
تم جو آؤ تو شاخ ساتھ جلے

تھم گئی یوں پھوار جذبوں کی
تیری تصویر چھُو کے ہاتھ جلے

کل مرے ایک خط کی حدت سے
کتنے بوسیدہ کاغذات جلے

سب چراغوں کی لو لرزنے لگی
اب کہاں جا کے زرد رات جلے

”

ایک آنچل کی آنچ سے تاعمر
ہم جلے اور تاحیات جلے

کوفہ و شام میں ہے امن واماں
چند خیمے لبِ فرات جلے

دل اور پنچھی

دل اور پنچھی

ایک بار جب پر پھیلاتے ہیں

اُڑتے ہی جاتے ہیں

بادل، بجلی، آندھی، طوفاں راہ دکھاتے ہیں

سب تھے حیرانی میں جھلمل عکس تھا پانی میں

چودھویں کا وہ چاند آیا پھر میری کہانی میں

جس کی ٹھنڈک میں سپنے تعبیریں پاتے ہیں۔

راتیں بھی پرواز میں گزریں دن بھی اُڑانوں میں
کومل جذبوں سے کھیلتے ہیں مچھول چٹانوں میں
چاہت میں سارے افسانے سچ بن جاتے ہیں

منزل منزل تیری طرف بڑھ رستا جاتا ہے .
چپکے چپکے تُو آنکھوں میں بستا جاتا ہے
تُجھ سے دھڑکن کے رشتے سانسوں کے ناتے ہیں

اشعار

(پاکستان کی چالیسویں سالگرہ کے حوالے سے)

ملبوس کی اک سلوٹ نہ گئی زلفوں سے نہ پیچ و خم نکلے
زندوں کی طرح جینے کے لیے چالیس برس بھی کم نکلے

آنگن میں چٹکتی ہیں کلیاں جلتے ہیں چراغ منڈیروں پر
کچھ کھوئے ہُوؤں کی تلاش میں پھر مُیں اور مرے موسم نکلے

رشتوں کی لرزتی دیواریں پہلی ہی دھوپ کی نذر ہُوئیں
خود سے بھی کوئی ناتا نہ رہا جب تیری گلی سے ہم نکلے

تہذیب کے نام پہ خود ہم نے ویران کھنڈر کی کھدائی کی
ملبے کو ہٹا کر دیکھا تو کہیں تم نکلے کہیں ہم نکلے

کاغذ پہ یہ عکس کا دھبا سا میں بھی ہوں مرا ہمزاد بھی ہے
یہی اِک تصویر دکھانے کو ہر روز کئی البم نکلے

دل کے اُجالوں میں جیتے ہیں

دل کے اُجالوں میں جیتے ہیں
تیرے خیالوں میں جیتے ہیں
یادوں کے سو شہر بسا کر
ایک اکیلے گھر میں رہنا
پھر اک دھیان کے پیچھے پیچھے
ساری عمر سفر میں رہنا
دل کے اُجالوں میں جیتے ہیں

اُلجھے بال سنور جاتے ہیں
لمبی راتیں کٹ جاتی ہیں
پھیلے غم بکھری اُمیدیں
اپنے آپ سمٹ جاتی ہیں
دِل کے اُجالوں میں جیتے ہیں

ہجر میں تو مشکل لگتا ہے
وصل میں لیکن کھیل ہے جینا
دُنیا چاہے کچھ بھی سمجھے
دِل سے دِل کا میل ہے جینا
دِل کے اُجالوں میں جیتے ہیں
تیرے خیالوں میں جیتے ہیں

سَیل در سَیل ہم رواں ہی رہے
گھر سے نکلے تو "بے اماں" ہی رہے

جن سے دل کی زمین چھوٹ گئی
عمر بھر زیرِ آسماں ہی رہے

تُو نے دیکھا تھا کس نظر سے کہ ہم
آج تک خود سے بدگماں ہی رہے

جھُوٹ کو خونِ دل سے سچ نہ بنا
داستاں ہے تو داستاں ہی رہے

تیر واپس گئے ہیں آتے ہی
ہر نشانے پہ کچھ نشاں ہی رہے

آگیا ہے تو اب چمن سے نہ جا
بات پھولوں کے درمیاں ہی رہے

کیسی بستی تھی آگ سے پہلے
اب تو بس ایک دو مکاں ہی رہے

کھڑکیاں دل کی بند رہنے دو
آگ تو بجھ گئی دھواں ہی رہے

خستہ خیمے کے روزنوں پہ بھی رات
کچھ ستارے سے مہرباں ہی رہے

بیروت

(جولائی ۱۹۸۲ء)

دلوں سے اُٹھتے دھوئیں میں دکھائی دیتا ہے
لُٹے ہُوؤں کا نشیمن ، جلا ہُوا بیروت
وہ جلتے گھر جہاں پہچان تک جُھلس جائے
سُنیں گے کیسے فضاؤں میں شور ہے کہ سکوت

فصیلِ شہر پہ تاریکیوں کا پہرا ہے
نظر میں راکھ ہے لاشے ہیں اور کچھ بھی نہیں
بنامِ امن و اماں جنگ بندیوں کے فریب
مداریوں کے تماشے ہیں اور کچھ بھی نہیں

سپاہِ جور و ستم پانیوں پہ قابض ہے
یہ سلسلہ تو وہی ہے جو کربلا سے چلا
ہر ایک چہرے سے ظاہر ہیں شمر کے خدوخال
کہیں حبیب مظاہر نظر نہیں آتا

ابھی ضمیرِ زمانہ خموش ہے کہ تمھیں
اس ابتلا میں بھی تازہ کمک نہیں پہنچی
ہے جن کو حکم کہ ایوانِ مصلحت میں رہیں
صدا تمھاری ان آقاؤں تک نہیں پہنچی

بھٹکتی پھرتی ہے میری دعائے نامقبول
یہ ایک جبر ہی بس میرے اختیار میں ہے
امیرِ لشکرِ منصور جانتا ہو گا
دُعا کو اُٹھا ہُوا ہاتھ بھی حصار میں ہے

دُور سہی لَوٹ کے گھر آئے گا
شام ڈھلے چاند نظر آئے گا

ختم ہُوئیں جب مری خوش فہمیاں
اَدھ کِھلی آہوں میں اثر آئے گا

لے چلا ہُوں یاد کی پرچھائیاں
کام یہی رختِ سفر آئے گا

بے سروسامانیوں کو لُوٹنے
شاخ سے اک پھُول اُتر آئے گا

طے کرے گی آنکھ جو صحراؤں کو
پانیوں کا ایک سفر آئے گا

ناؤ اُتر جائے گی پاتال میں
سطح پہ اِک نقش اُبھر آئے گا

رات گئے گھر نہ سجا سو بھی جا
خواب کوئی اب نہ اِدھر آئے گا

اپنے اشعار کو رسوا سرِ بازار کروں
کیسے ممکن ہے کہ میں مدحتِ دربار کروں

دل میں مقتول کی تصویر لیے پھرتا ہوں
اور قاتل سے عقیدت کا بھی اظہار کروں

یہی منشورِ محبت ہے کہ وہ پیکرِ ظلم
جس کو نفرت سے نوازے میں اُسے پیار کروں

اب مرے شہر کی پہچان ہے اِک عہدشکن
شہریت بدلوں کہ تاریخ کا انکار کروں

رات بھر جاگ کے تعمیر کروں قصرِ اُمید
صبحِ تکمیل سے پہلے اسے مسمار کروں

کاش سبھی دن ایسے ہوں

(عید کا نغمہ)

(بچوں کے لیے)

کاش سبھی دن ایسے ہوں
جو جی چاہے وہی خریدوں
جیب میں اتنے پیسے ہوں

رنگ برنگے کپڑے میرے
نئے نئے ہوں جوتے میرے
جیسے سوچوں ویسے ہوں
کاش سبھی دن ایسے ہوں

کتنا اچھا ہے حلوائی
سب کو کھلاتا ہے جو مٹھائی
یا رب سب اس جیسے ہوں
کاش سبھی دن ایسے ہوں

ہاتھی، بھالو، بندر، گائے
ابّو جو بھی کھلونے لائے
مجھ سے پوچھے کیسے ہوں
کاش سبھی دن ایسے ہوں

بڑھ کر چاند ستارے چھو لوں
جن جھولوں پر بھی میں جھولوں
اونچے وہ ہر شے سے ہوں
کاش سبھی دن ایسے ہوں

ہم یونہی مسکراتے رہیں

(عید کا نغمہ)

(بچّوں کے لیے)

ہم یونہی مُسکراتے رہیں
گیت خوشیوں کے گاتے رہیں

دوستوں سے یہ مِلنے کا دِن
آ گیا پھول کِھلنے کا دِن
ایسے دن روز آتے رہیں
گیت خوشیوں کے گاتے رہیں

جو بھی رُو ٹھے ہیں مَن جائیں گے
راستے خود ہی بن جائیں گے
ہم اگر آتے جاتے رہیں
گیت خوشیوں کے گاتے رہیں

گھونسلوں میں اُداسی نہ ہو
ایک چڑیا بھی پیاسی نہ ہو
سب کے سب چہچہاتے رہیں
گیت خوشیوں کے گاتے رہیں

آئے پریوں کی رانی کوئی
پیاری پیاری کہانی کوئی
وہ سُنے ہم سُناتے رہیں
گیت خوشیوں کے گاتے رہیں

اندیشوں میں ڈوبی خبر

(۱۹ فروری ۲۰۰۷ء کو پرائمری سکول گڑھی قمردین پشاور میں بموں کے دھماکے سے ضائع ہونے والے معصوم بچوں کے سوگ میں)

کچھ اس طرح سے انھیں مدرسے میں رات آئی
کہ اب وہ گھر نہیں آئیں گے لوگ کہتے ہیں

جنھیں ہم اپنی دُعاؤں کے ساتھ چھوڑ آئے
وُہ لوٹ کر نہیں آئیں گے لوگ کہتے ہیں

ہر ایک آنکھ کی ٹھنڈک سبھی کے نُورِ نظر
کہیں نظر نہیں آئیں گے لوگ کہتے ہیں

جو برگِ گُل خس و خاشاک کی طرح بکھرے
کبھی اِدھر نہیں آئیں گے لوگ کہتے ہیں

یہ ٹوپیاں ہیں انھی کو سنبھال کر رکھنا
اب ان کے سر نہیں آئیں گے لوگ کہتے ہیں

❋

یہ کوئلے ہیں یہ کچھ لوتھڑے ہیں ملبے میں
زیادہ راکھ بھی ملنے کا احتمال نہیں

بدن بموں میں اُدھر اور دل غموں میں اِدھر
ستم شعاروں کو اس ربط کا خیال نہیں

کتاب قتل ہوئی ہے لہو لہو ہے ورق
نیا سبق ہے یہ تاریخ کا سوال نہیں

ہمارے کم سن و معصوم جانے والوں کے پاس
وہ زندگی ہے جو پابندِ ماہ و سال نہیں

غروبِ جاں کی قیامت گھڑی میں اُبھرا ہے
تمھاری یاد کا سورج جسے زوال نہیں

علی اصغر

کربلا میں اے علی اصغر ترا اعلانِ جنگ
حشر تک لیتا رہے گا ظلم سے تاوانِ جنگ

ریت جلتی ریت پر تھا تیرا خیمہ بے فرات
خشک ہونٹوں سے تجھے لکھنا پڑا فرمانِ جنگ

مسکراہٹ تیغ تیری بے زبانی تیری ڈھال
چھ مہینے کا مجاہد مختصر سامانِ جنگ

تیر کھایا خوں بہایا مسکرایا جان دی
باپ کے دو ہاتھ بس تیرے لیے میدانِ جنگ

تو کر پہلے وار ہی میں سُرخ رُو پایا گیا
رُو سیاہوں کے دِلوں میں رہ گئے ارمانِ جنگ

شرمسار اپنے ہی معیارِ عداوت سے غزاں
پھول کی اِک پنکھڑی کو جان کر عنوانِ جنگ

خاکِ دل

میری آنکھوں میں سب رنگ موجود ہیں اور یہ آنکھیں ہیں تیرے لیے
تیرے ذرّے شعاعوں کا منشور ہیں چاند تارے ہیں تیرے دیے

دل پہ موسم غموں کے اُترتے رہے اور زمانے گزرتے رہے
تُو نے مجھ کو قرینے کا جینا دیا چاک سینے کے تُو نے سیے

ایک خوشبو رواں سارے خوابوں میں ہے روشنی سی گلابوں میں ہے
جگمگاتی رہیں رات کی رانیاں اور مہکتے رہیں موتیے

چاندنی بادلوں سے جو چھننے لگی تیری تصویر بننے لگی
اب کسی حال میں بھی پریشاں نہیں تُو نے دل پر وہ احساں کیے

زندگی جب بھی تری یاد سے گھبراتی ہے
پیڑ سے ایک امربیل لپٹ جاتی ہے

ماند پڑ جائے اگر شمعِ محبت تو نگاہ
چاند پر پھر تری تصویر بنا آتی ہے

وصل اور ہجر کے دو رنگ نمایاں نہ سہی
میری آنکھوں میں دھنک آج بھی لہراتی ہے

آرزو، عکس بکھرتے ہوئے آئینے کا
جس کو مہمان سمجھتے ہو ملاقاتی ہے

خواب گوں سائے نظر آتے ہیں بے خوابی کے
میرے کمرے کی فضا کتنی طلسماتی ہے

جس طرف دیکھنا جدھر جانا
مسکرا کر اُداس کر جانا

شمع وعدہ جلی تو بھول گئے
اپنی راتوں کا بے سحر جانا

مشغلہ اپنی چاند راتوں کا
دیکھنا خواب اور ڈر جانا

آج بھی زندگی میں شامل ہے
تیرے کوچے سے ہو کے گھر جانا

بنا رہا ہُوں تری آنکھ کے اشارے پر
اسی کنارے کی تصویر اُس کنارے پر

اُداس شام سے اک نام مَیں نے سیکھا تھا
سو لکھ رہا ہُوں وہی صُبح کے ستارے پر

انہی کے کھوج میں موسم بھی، شاخ و شبنم بھی
گُلاب کس نے کھِلائے ہیں بہتے دھارے پر

سب اپنی اپنی خریداریوں کی فکر میں ہیں
نظر کسی کی نہیں ہے مرے خسارے پر

اسی لیے تو زمیں پر وہ اجنبی نہ لگے
میں ان سے پہلے ملا تھا کسی ستارے پر

ہوائیں آج بھی پیغامِ امن لائی ہیں
کہ اس نے کاٹ دیئے فاختہ کے سارے پَر

افسوس حاصل کا

بھری آنکھوں میں حیرت کتنے اَن دیکھے جہانوں کی
رہی زیرِ قدم وسعت زمینوں آسمانوں کی
تخیل سے بھی اونچی ہے فضا میری اُڑانوں کی
تصور میں مرے موجود تصویریں زمانوں کی

جو لفظوں سے ورا ہیں وہ معانی دیکھ لیتا ہوں
میں تصویروں میں پانی کی روانی دیکھ لیتا ہوں
نئے کاغذ پہ تحریریں پرانی دیکھ لیتا ہوں
زلیخائیں پسِ خوابِ جوانی دیکھ لیتا ہوں

جہاں ماضی کی ہر تصویر مستقبل میں رہتی ہے
جواں جذبوں کی حدت برف کی اک سل میں رہتی ہے
سبھی صحراؤں کی وسعت بس اک محمل میں رہتی ہے
وہیں اب کچھ دنوں سے ایک خواہش دل میں رہتی ہے

نہ کاش اس طرح مجھ کو دولتِ افکار دی ہوتی
نہ میرے لفظ کو مفہوم کی مہکار دی ہوتی
پَر پرواز ملتے اور نہ یہ رفتار دی ہوتی
کئی کھوٹے کھرے سکّوں کی بس جھنکار دی ہوتی

ہر صبح لکھوں...

ہر صبح لکھوں ہر شام لکھوں
لمحوں پر تیرا نام لکھوں

جب جائے نسیم تری جانب
ہر جھونکے پر پیغام لکھوں

سب تارے دیکھتی ہو گی تُو
کس کس پہ اپنا نام لکھوں

ہر سانس پہ ہجر کے موسم میں
رُودادِ دلِ ناکام لکھوں

اِک نام کو ہر بیماری میں
تسکیں کہوں آرام لکھوں

کچھ لکھ نہ سکوں اب خط کے سوا
اور خط میں صرف سلام لکھوں

ایک تابلو

رواں دواں ہے قیدیوں کا مختصر سا کارواں
نہ ہتھ کڑی ہے ہاتھ میں نہ پاؤں میں ہیں بیڑیاں

شمیم شرحِ درد سے کلی کوئی کھلی نہیں
کراہتا رہے بدن زباں مگر ہلے نہیں

نگاہ درد آشنا، جبیں تمام کرب ہے
یہ مسکراہٹیں نہیں متاعِ حرب و ضرب ہے

بچاؤ — خالی ہاتھ سے کیا تو زخم سہہ گئے
ہر ایک تیر کے لیے کمان بن کے رہ گئے

ثبات آشنا ہیں یہ نہ واقفِ دوام ہیں
جھکے ہوئے ہیں سر کہ سب غلام ہی غلام ہیں

نہ کوئی ربط چاہیے نہ کوئی رشتہ چاہیے
فدا کریں گے جان و تن بس اک اشارہ چاہیے

نہ ان میں شہ جہان ہے نہ کوئی ارجمند ہے
تمام لب سِلے ہوئے ہر اک زبان بند ہے

نہ جاتے تم

اُور ان آنکھوں میں اب نیلے سمندر رقص کرتے ہیں
اُداسی کے پرندے دِل کے ساحل پر اُترتے ہیں

سکوں نا آشنا ہو درد سے دامن چھڑا کر بھی
سُنا ہے خوش نہیں ہو تم نئے لوگوں میں جا کر بھی

مرے آنسو ہی پڑھ لیتے تمھیں جس روز جانا تھا
تمھارے سامنے لیکن زمانہ ہی زمانہ تھا

نہ جاتے تم تو ہم اِک دوسرے میں ایسے گُم ہوتے
تمھاری آنکھ میں خوشیاں مری آنکھوں میں تم ہوتے

بجھتے ستارے دیکھ رہے تھے
ہم بھی اشارے دیکھ رہے تھے

قطبی تارے کی بے سمتی
سات ستارے دیکھ رہے تھے

چھن گئی لوگوں کی بینائی
نین تمہارے دیکھ رہے تھے

کون مجھے لہروں سے بچاتا
صرف کنارے دیکھ رہے تھے

سُنتا کون صدا زخموں کو؟
لوگ تو سارے دیکھ رہے تھے

گرد آلود فضا کو وُہ چھت پر
بال سنوارے دیکھ رہے تھے

پھر تو اس بے نام سفر میں کچھ بھی نہ اپنے پاس رہا
تیری سمت چلا ہوں جب تک سمتوں کا احساس رہا

تیری گلی میں ٹوٹ گئے سب جرم و سزا کے پیمانے
ایک تبسم دیکھنے والا ساری عمر اُداس رہا

گل چیں کے چہرے کی رنگت روز بدلتی رہتی تھی
رنج و خوشی کے ہر موسم میں پھول کا ایک لباس رہا

جن کی درد بھری باتوں سے ایک زمانہ رام ہوا
قاصر ایسے فن کاروں کی قسمت میں بن باس رہا

صلیبِ غم پہ جو سرسبز خواب جھول گئے
مرے درخت بھی اب موسموں کو بھول گئے

ہوائے شام کی زد میں رہا گلِ لرزاں
سفیرِ صُبح بھی آئے مگر ملول گئے

نظر نہ آئی کہیں بھی بہارِ بے آثار
گزشتہ دَورِ خزاں کا رنگ تو پھول گئے

پھر ایک بار یہی پوچھنا پڑا خود سے
ہم اُن کے سامنے کیوں توڑ کر اصول گئے

تری پسند کی چیزیں خریدنے والے
تری پسند کی چیزوں کے نام بھول گئے

اُسی کو ڈھونڈ رہے ہیں اسی سے چھُپ چھُپ کے
وُہ ایک شخص کہ ہم جس کی شکل بھول گئے

✺

فضائے صحنِ چمن جن کو سازگار آئی
انہی گُلوں کا پتا پُوچھ کر بہار آئی

ہزار بار مجھے لے گئی ترے در پر
وہ آرزو، جو مرے دل میں ایک بار آئی

لگا جو زخم تو ٹوٹا حصار خوابوں کا
کُھلی جو آنکھ تو پتھر سے بُوئے یار آئی

جہاں ٹھہر نہیں سکتی شعاعِ مہر اک پل
مری نگاہ وہیں سے زندگی گزار آئی

قمار خانۂ غم میں مری زیاں کاری
خوشی نہ جیت سکی اور تجھے بھی ہار آئی

سُلا کے سیج پہ قاصر شگفتہ یادوں کو
شبِ فراق انھیں ہر طرف پُکار آئی

جب طلب کی اجازت ملی
روشنی سے حرارت ملی

عکس ہجرت سفینہ بنا
پانیوں پر سکونت ملی

کیسے دیوار کے اُس طرف
اِس طرف کی عبارت ملی

دوسرا نام لے کر بھی آج
دل کو پہلی سی راحت ملی

پچھلے گھروں میں کوئی بھی نہ تھا
ساتویں دَر سے نفرت بھی

دل بھی پہلو بچاتا رہا
آنکھ بھی حسبِ عادت ملی

ہر اِک رستا وہیں آ کر مِلے گا
اسی رستے میں اُس کا گھر مِلے گا

دُکھی دیوارِ بے سایہ ہے جس میں
بھٹکتی دستکوں کو در مِلے گا

دِیا جلتا نظر آئے نہ آئے
اُجالا سا منڈیروں پر مِلے گا

دریچوں سے ستارے جھانکتے ہیں
اور اکثر چاند بھی چھت پر مِلے گا

پرندے اس طرف جاتے بہت ہیں
وہیں کوئی نہ کوئی پَر ملے گا

ہَوا ذرّوں کو کم کم چھیڑتی ہے
وہیں منظر کا پس منظر ملے گا

مہکتی موتیا، سرسبز آنگن
اسی فائل میں سب دفتر ملے گا

بس اب تو اک نشانی رہ گئی ہے
وہیں قاصرؔ تمھیں اکثر ملے گا

تاخیر

پیار کا لمحہ

صوتِ بہار، نمو کی دستک

خود میں چھپا کر مٹھی بھر مہکار تری خاموشی کی

شاخِ گُلاب نے اپنے پہلے غنچے سے سرگوشی کی

دل کی صدا پر

خوشبو سے اِک پھُول چھُپا کر

مَیں جب تیرے پاس آیا تو لوگ وہاں سے جا بھی چُکے تھے

مُجھ سے بڑھ کر چاہنے والے ہار تجھے پہنا بھی چُکے تھے۔

کتنے ہی پھول ترے دامن تک آ بھی چکے مُرجھا بھی چکے تھے

شاخ بھی ہے افسردہ میری تنہائی بھی

پہلی نسبت بن گئی پہلی رسوائی بھی

پیار کا لمحہ

سچائی بھی !

ہرجائی بھی !!

بادلوں کے اُڑتے سائے

بادلوں کے اُڑتے سائے اور پیاسی آرزو

یاد کی رعنائیاں احساس کی تنہائیاں
اِک طرف جلوے ہی جلوے اک طرف پرچھائیاں
مسکرائیں اشک جب رونے لگیں شہنائیاں
سات رنگوں میں سمائی اِک ذرا سی آرزو

راہ میں اب شہر آئیں یا کوئی جنگل پڑے
چاند نے بدلا ہے پہلو اور ستارے چل پڑے
کیوں نگاہیں مسکرائیں کیوں جبیں پر بل پڑے
ہے کبھی چہرہ کبھی چہرہ شناسی آرزو

دل میں لو دیتے ہُوئے بے نام داغوں کے لیے

بُجھتی شمعوں کے لیے جلتے چراغوں کے لیے

زیست کی پھلواریوں میں جاں کے باغوں کے لیے

سبز چاہت آرزو، پیلی اُداسی آرزو

نگاہوں سے ترے دِل تک

نگاہوں سے ترے دل تک سفر ہے
جوانی مختصر ہے
مری ہر سانس تیری رہ گزر ہے
کہانی مختصر ہے

نہ دریا میں روانی ہے نہ پانی
سفینہ موج پر ہے
مگر دِل کی وُہی عادت پُرانی
کنارے پر نظر ہے

مرے دل سے بدن تک زخم پہنچے
اُداسی چارہ گر ہے
بدن سے پیرہن تک زخم پہنچے
مسیحا بے خبر ہے

ترے کُوچے میں گھر بھی کم نہیں ہیں
نہ دستک ہے نہ در ہے
گلستاں میں شجر بھی کم نہیں ہیں
پرندہ ہے نہ پَر ہے

۱

دعوت

آنکھوں کو سمجھا جانا
بجھتے دیپ جلا جانا

کل بھر تیرے ہوتے ہوئے
سب نے مجھے تنہا جانا

تیرے لیے تو آساں ہے
اُجڑا شہر بسا جانا

تن کی چٹکتی کلیوں سے
من کا نگر مہکا جانا

پھر دو چار شگوفوں کو
اپنا نام بتا جانا

خوش بو سے خوش بو ہے جُدا
رنگ سے رنگ بلا جانا

دِل سے روٹھی دھڑکن کو
پھر اِک بار منا جانا

اِتنا ضروری کام نہیں
فرصت ہو تو آ جانا

چاند بُجھا

۱

چاند بُجھا تارے مرجھائے وہ نہیں آئے
بیٹھے تھے ہم آس لگائے وہ نہیں آئے

صُبح بہار کے ساتھ آنے کا کیا تھا وعدہ
پھیلے شامِ خزاں کے سائے وہ نہیں آئے

دل کی دھڑکن پر ہو جب دستک کا دھوکا
سناٹے کی گونج بتائے وہ نہیں آئے

ٹوٹتی آس کی رُکتی سانسوں سے سرگوشی
سب آئے ہیں وُہ نہیں آئے وہ نہیں آئے

دھندلی دھندلی شکلیں ہیں منظر نہیں کھلتے
کون اب آنکھوں کو سمجھائے وہ نہیں آئے

کنارے پہ لائی مجھے آس کیوں
نظر آئے دریاؤں کو پیاس کیوں

یہ آنکھیں، یہ جلووں کی پرچھائیاں
تری یادگاریں مرے پاس کیوں

بدلتی رُتیں مجھ سے ناراض ہیں
مجھے آگیا تیرا غم راس کیوں

فضاؤں کو دی بے کراں بے حسی
تو بخشا پرندے کو احساس کیوں

جہاں بھر کو دولت ملی پیار کی
فقط میرے حصّے میں افلاس کیوں

کب تک رہوں اُداس مرے چاندراب تو آ
آنکھوں کے آس پاس مرے چاندراب تو آ

اک دید کی اُمید پہ جیتا ہُوا چکور
کرتا ہے التماس مرے چاندراب تو آ

مایوسیوں سے بجھتے چراغوں کے ساتھ ساتھ
لو دے اُٹھی ہے آس مرے چاندراب تو آ

جس دن سے تُو چھُپا ہے سیہ پوش رات نے
بدلا نہیں لباس مرے چاندراب تو آ

سُورج خریدتا تھا اسے اپنے جام سے
بیچی نہ میں نے پیاس مرے چاندراب تو آ

۱

دھیان ہو یا دِل کوئی بھی سیدھے رَستے پر نہیں ہوتا
جب میں تیری راہ گزر پر محوِ سفر نہیں ہوتا

کیا اِس عہد کے سارے جادُو کھو بیٹھے تاثیریں
پیچھے مُڑ مُڑ دیکھنے والا کیوں پتھر نہیں ہوتا

فن سے وقت کی دیواروں پر آویزاں رہتی ہیں
اکثر وہ تصویریں ، جن کا پس منظر نہیں ہوتا

اُس کی لو مدھم ہو جائے مَیں جب دیپ جلاؤں
مَیں جو شہر بسا لوں اس میں میرا گھر نہیں ہوتا

تجھ سے بچھڑ کر میری طرح رو سکتا ہے غیر بھی لیکن
دیکھ لے میرے اشکوں کو یہ رنگ اُدھر نہیں ہوتا

۱

اتنی بار چمن میں آئیں خالی ہاتھ بہاریں
ترا گماں اب موجِ نسیم کی آہٹ پر نہیں ہوتا

جس سے مَیں زندہ رہا ہوں وہ لہو میرا نہ تھا
آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ تُو میرا نہ تھا

مجھ کو اپنی نارسائی سے کوئی شکوہ نہیں
تُو جہاں تھا وہ مقامِ جستجو میرا نہ تھا

مَیں کہ برگِ تنویر کی نشو و نما کرتا رہا
روشنی کی شاخ پر عکسِ نمو میرا نہ تھا

اس کو بھی میری طرح تھی زندہ دشمن کی تلاش
قتل کی نیّت سے آیا جو عدو میرا نہ تھا

اصولِ ارتقاء

۱

(ا)

دریچے سے کس نے نظر ڈال دی
کہ شرما کے شاخِ قمر جھک گئی
ستاروں کی نشو و نما رُک گئی

(ب)

نشو و نما کے راز تو اکثر سورج سے بھی چھپانے ہیں
صحنِ چمن میں دھوپ کہاں کی؟ حدِ نظر تک سائے ہیں
پھر بھی یہاں پر ہم نے کتنے سُورج مُکھی اُگائے ہیں

(ج)

پھر وہی مہرباں کہہ رہا تھا
کیسے آئینِ فطرت میں توڑوں
اک جیے گا مریں گے کروڑوں

ساون کی سُہانی رات بھی ہے

ساون کی سہانی رات بھی ہے برسات بھی ہے
ہاتھوں میں تمھارا ہاتھ بھی ہے برسات بھی ہے

کل پھر حالات کی دُھوپ میں جلنا ہے مُجھ کو
گو آج تمھارا ساتھ بھی ہے برسات بھی ہے

آنکھوں میں سُلگتے ہجر کی رُت لہراتی ہُوئی
ہونٹوں پر وصل کی بات بھی ہے برسات بھی ہے

احساس کے بھیگے پُھول کہو تو پیش کروں
ہاتھوں میں مرے سوغات بھی ہے برسات بھی ہے

۱

ہُوا خواب خواب سے بدگماں مرے رتجگے میں نہیں ہے وُہ
وہ جو عکسِ ہجر و وصال تھا کسی آئنے میں نہیں ہے وُہ

جو مہکتے لمحوں کا رنگ تھا مرے پہلے پیار کے چار سُو
یہاں یاسمین و گلاب کے کسی سلسلے میں نہیں ہے وُہ

کئی مہر نور بکف رہے مری زندگی کے مدار میں
وہ جو زرد چاند میں بات تھی کسی دوسرے میں نہیں ہے وہ

چلا جس کے شوق میں گھر سے مَیں گیا اپنے شام و سحر سے میں
ہُوا شرمسارِ سفر سے مَیں مرے قافلے میں نہیں ہے وُہ

نہ اُمید ہے نہ کوئی لگن یہاں لوگ چلتے ہیں عادتاً
وہ جو منزلوں کا گمان تھا کسی راستے میں نہیں ہے وُہ

اقبال

۱

صبحِ تہذیب سے کر دیتا ہے شام آئینہ
تب کسی نکس پہ لکھتا ہے دوام آئینہ

سامنے حسن کی تصویر کوئی آئی ہے
یا سناتا ہے مجھے تیرا کلام آئینہ

تیرے افکار میں سوز او پیے حیرانی کے
بند ہو آنکھ تو آتا نہیں کام آئینہ

ایک مدت سے جو پہچان کے بحران میں ہیں
ایسے چہروں کے لیے بس ترا نام آئینہ

جگمگاتا ہے ترے شعر کی تابانی سے
دل قاتھر جسے کرتا ہے سلام آئینہ

ایک تھا غیر یہاں

ایک تھا غیر یہاں اِک مرا ہمسایہ تھا
میری ہستی کو تو بس تُو نے ہی منوایا تھا

تو برس دھوپ کی شدت میں فراوانی کے
پھر جو دیکھا تو وہاں تو تھا ترا سایہ تھا

زندگی سانس ہی لینے کو سمجھ بیٹھے جو لوگ
تُو نے اعزاز سے جینا انھیں سکھلایا تھا

عزتِ نفس کا پیمانہ حسنِ آزادی
تُو نے سب سے مرا حصہ مجھے دلوایا تھا

مَیں نے پُوچھا تھا کہ اخلاص کسے کہتے ہیں
ایک بچہ تری تصویر اُٹھا لایا تھا

آزمائش میں کوئی

آزمائش میں کوئی تجھ کو صدا دیتا ہے
اور تو آگ کو گلزار بنا دیتا ہے

دے کے اِک عکسِ نظر آنکھ کے آئینے کو
کتنے نادیدہ جہانوں کا پتا دیتا ہے

ظرفِ سائل کو بناتا ہے عطا کا معیار
کہیں صرصر تو کہیں موجِ صبا دیتا ہے

تُو ہی ہر لہر کو دیتا ہے ڈبونے کا شعور
تُو ہی کشتی کو کنارے پہ لگا دیتا ہے

یوں تو نفرت کے سمندر ہیں دلوں میں حائل
ہاں ترا نام کناروں کو ملا دیتا ہے

حمد کا پھول سرِ شاخِ یقیں دیکھ کے دل
وہم کے سارے پرندوں کو اڑا دیتا ہے

تاریکیِ جاں نے

تاریکیِ جاں نے صدیوں تک آئینۂ دِل کو دھندلایا
اے صبحِ جمال کی پہلی کرن پھر تیرا عکس نظر آیا

اِک نقشِ کفِ پا سے اُبھرے سب فلسفے ساری تہذیبیں
کتنے تاریک زمانوں کو اِک جلوۂ رُخ نے چمکایا

دو شہروں سے پہلے انساں کی ہر اِک تعریف ادھوری تھی
اِک شہر جو تُو نے چھوڑ دیا اِک شہر جو تُو نے اپنایا

انساں کو شعورِ ذات ملا دانش کو رنگِ ثبات ملا
تُو نا معلوم جہانوں کو معلوم زمانوں تک لایا

ہر عہد کی نشو و نما کے لیے وہ مہر و محبّت کا موسم
یخ بستہ دنوں میں دُھوپ بنے اور دُھوپ کی شدّت میں سایہ

۱

جو ہواؤں میں

جو ہواؤں میں ترے نام کو قندیل کرے
روشنی اس کے لیے راستہ تبدیل کرے

سارے پھولوں کو رسولوں کو ہے ازبر کہ وہ ذکر
کبھی تورات کے لب پر کبھی انجیل کرے

نامکمل نظر آتی ہے دھنک ہو کہ حیات
تیرا کردار ہر اک رنگ کی تکمیل کرے

تیرے پیغامِ محبت سے الگ کچھ بھی نہیں
صبحِ نو کی یہ جہاں کوئی بھی تاویل کرے

غم کے ظلمات میں شاداب جزیروں کا نشاں
وہ سفینہ جو ترے حکم کی تعمیل کرے

تیری سیرت کو ترے عہد کو سمجھا ہی نہیں
جو کسی دَور کے انسان کی تذلیل کرے

دل ترستا ہے مدینے کی ہواؤں کے لیے
جیسے بارش کی دُعا تشنہ ابابیل کرے

جب کبھی سوچا ہے کہ مَیں ان کا سراپا لکھوں
ان لکھے لفظ پہ سایہ پرِ جبریل کرے

۱

ظلم و ظلمت کے زمانوں پہ زوال

ظلم و ظلمت کے زمانوں پہ زوال آیا تھا
جب تری عمر کا چالیسواں سال آیا تھا

پہلے عرفاں ترے آئینۂ رُخ نے بخشا
اور پھر آخری آئینِ جمال آیا تھا

پھر مرے سینے میں آباد ہُوئے ہیں کیسے؟
ان بُتوں کو تو میں بستی سے نکال آیا تھا

دِل، ترے گھر سے چلا ہے مہِ کامل بن کر
تیری دہلیز پہ مانندِ ہلال آیا تھا

اُس پہ قرباں مری پروازِ تخیل کہ جسے
عرش پر فرش نشینوں کا خیال آیا تھا

ذکرِ شہکارِ مدینہ ہی سے شہ پارہ ہے
ورنہ ہر شعر بھٹکتا ہوا سیّارہ ہے

دل کا اِک زخم بھی کیا رنگ دکھاتا ہے مجھے
پھول دیکھوں تو مدینہ نظر آتا ہے مجھے

ظلمتِ وادیِ جاں میں

ظلمتِ وادیِ جاں میں بھی اُجالے سے ملے
کس قدر چاند تری یاد کے ہالے سے ملے

آہ جاتی ہے جو سینے سے مدینے کی طرف
کتنے اعزاز اسے دیس نکالے سے ملے

آسماں، حدِ نظر تک ہے فروزاں کر اسے
دو ورق آپ کی رفعت کے رسالے سے ملے

نہ سمندر کی تہوں میں ہیں نہ دریاؤں میں
جتنے موتی کر ترے ڈوبنے والے سے ملے

اَبدیت پہ اگر خوف فنا طاری ہو
آئے اور ان کے کبھی چاہنے والے سے ملے

ہاں مرے نام میں شامل مرا پیغام بھی ہے
جس کو ملنا ہو مجھے اُن کے حوالے سے ملے

۱
۲
۰

پیاس کے صحرا میں

پیاس کے صحرا میں جس نے کاشت کی فصلِ نجات
اس لہو کی لہر کو اب تک سلامی دے فرات

ایک لمسِ جاودانی سے حیاتِ بے ثبات
لکھ رہی ہے نام تیرا دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ

گو قلم ہوتے گئے لیکن علَم ہوتے گئے
جھک نہیں سکتے تری تائید میں اُٹھے جو ہاتھ

وقت کی ٹوٹی طنابیں، عصر کے جلتے خیام
بے کفن کرنوں کے لاشے شام کی کالی قنات

صبح تک جلتا رہا ہر نوکِ نیزہ پر چراغ
شام ہی سے بجھ گئی تھی ظلم کی تاریک رات

ریت کے ذرّوں سے ڈھالے مہر و مہتاب و نجوم
کائناتِ کربلا پر ڈال کر اک عکسِ ذات

کربلا نقش ہے اب لوحِ ابد پر کہ یہ شہر
پہلے مسمار ہُوا بعد میں تعمیر ہُوا

۱

نہ وسوسے نہ اندھیرے

نہ وسوسے نہ اندھیرے رگوں میں پلتے ہیں
کہ میرے دل میں بہتّر چراغ جلتے ہیں

پلٹ رہے ہیں پرندے گھروں کو اور بے کس
نہ لوٹنے کے لیے شہر سے نکلتے ہیں

ہوائے زرد میں سرسبز تھے جو خیمۂ خواب
وہ خواب راکھ ہوئے ہیں خیام جلتے ہیں

ٹھہر گیا ہے وہ تسلیمِ جاں کا لمحۂ درد
جہاں میں یوں تو مناظر بہت بدلتے ہیں

کچھ اس طرح سے لُٹے تیرے کارواں والے
کہ سوئے شام اُجالوں سے بچ کے چلتے ہیں

وہ سر، بلند نہ ہوتا جو نوکِ نیزہ پر
تو سرنگوں تھے جو اب سر اُٹھا کے چلتے ہیں

مَیں کربلا میں ہوں مَولا رہِ حسینؑ دِکھا!
کہ اِس دیار سے رستے بہت نکلتے ہیں

مصنف

کا

پہلا شعری مجموعہ

تسلسل

۱۹۷۷ء